ISSN Online : 2709-4030
ISSN Print : 2709-4022
Vol.6 No.2 2022

ناول "جندر": قدیم اور جدید تہذیب کا نوحہ خواں

i. وقار احمد
ii. ڈاکٹر روح الآمین
iii. ڈاکٹر جہانزیب شعورؔ

ABSTRACT

"Jandar" is the first novel of Akhtar Raza Salimi published in 2007. "Wali Muhammad" is the main character of "Jandar". Normally "Jandar" played an important role in the old civilization especially in village. Jandar converts wheat to flour. "Jandar" symbolize life of human beings. Story of this novel revolves around the old civilization and modern civilization. The story also tells us that how modenenism destroyed our daily life. In the following article the destruction of modern civilization and norms are discussed in detail with reference to the novel Jandar.

جب مشینیں ایجاد نہیں ہوئی تھیں۔ انسان صبح سویرے منہ اندھیرے جاگ جاتا۔ بیلوں کو جوت کر کھیتوں کی جانب نکل جاتا۔ پورا دن کام کر کے شام کو گھر لوٹتا۔ اس کار مسلسل کا ایک نتیجہ نکلتا تھا اور وہ تھا اناج۔ اس کے علاوہ بھی انسان کا ایک کام تھا اور وہ تھا محبت کرنا۔ انسان کے ملنے جلنے ہی کا نتیجہ تھا کہ مختلف داستانوں نے جنم لیا۔ رات کو کنبے کے تمام افراد کھانا تناول فرما کر رات گئے تک انگھیٹی کے ارد گرد بیٹھ کر کسی بزرگ سے داستان سنا کرتے تھے۔ اردو ادب میں عبد اللہ حسین کے ناول "اداس نسلیں" میں اس پرانی تہذیب کی عکاسی نظر آتی ہے۔ ناول کا مرکزی کردار 'نعیم' محض دو طبقات کی نمائندگی ہی نہیں کرتا بلکہ وہ دونوں تہذیبوں کا علمبردار دکھائی دیتا ہے۔ اختر رضا سلیمی نہ صرف پرانی تہذیب کے مٹنے کا نوحہ کرتے ہیں بلکہ جدید دور جسے ہم مشینی دور بھی کہہ سکتے ہیں، نے جس طرح انسان سے انسانیت چھین کر خود غرضی اور خود پسندی میں مبتلا کیا ہے۔ اس کے بارے میں بھی بتاتے نظر آتے ہیں۔ گویا کہ 'جندر' ایک طرف قدیم تہذیب جسے ہم مغلوب یا محکوم تہذیب کہہ سکتے ہیں اور دوسری طرف جدید تہذیب جسے ہم غالب تہذیب کہہ سکتے ہیں کہ نمائندگی کرتا ہے۔ اس کہانی میں ہمیں تہذیبوں کے آپس میں ٹھکراؤ کی وجہ سے انسان پر ہونے والے جبر کا نوحہ پڑھنے کو ملتا ہے۔ کہانی پڑھنے کے بعد یکدم قاری کی زبان سے وارد ہو جاتا ہے کہ:

زندگی جبر مسلسل کی طرح کاٹی ہے
جانے کس جرم کی پائی ہے سزا یاد نہیں [1]

صنعتی اور زرعی انقلابات کے رونما ہونے کے بعد ہی اس جدید زنگی نے اپنے پنجے گاڑھ دیئے۔ انسان مسلسل ارتقا کی جانب گامزن ہوتا ہے۔ اور یہ بھی اس ارتقائی مراحل کا شاخسانا ہے۔ ناول 'جندر' ہمیں یہ بھی بتاتا ہے کہ جب مشین انسان پر غالب آیا اور انسان سے اس کے کرنے کے کام چھین لیے۔ یعنی مشین نے جب انسانی جگہ لے لی تو اس وقت انسان کے اندر کے کائنات میں جو خلفشار رونما ہوا اور اس کے اندر کے کائنات پر جو اثرات ہوئے اس سے انسانی سماجی زندگی پر جو اثرات مرتب ہوئے۔ اس سے انسانی سماجی زندگی پر جو اثرات مرتب ہوئے۔ ان کا تذکرہ ملتا ہے۔ ہندوستان میں اس تہذیب کو بنیادیں کالونیالزم نے بھی فراہم کیں۔ مزید یہ کہ ہر معاشرہ بہتر سے بہترین کی جانب جانے کی تگ و دو میں لگا رہتا ہے۔ جس کی وجہ سے ایک خاص وقت کے بعد معاشرہ ازخود بھی کروٹ لینے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ اور سماج نئی اقدار اور نئی بنیادوں پر کھڑا ہو جاتا ہے۔ جو بھی نئی چیز متعارف ہوتی ہے۔ اس کے ہونے اور رہنے کے لیے لازم ہوتا ہے کہ وہ کسی پرانی چیز کو بدل کر اس کی جگہ لے لے۔ اس سے انسان کو سہولت تو میسر آجاتی ہے مگر اس کے اندر جو دراڑیں پیدا ہو جاتی ہیں س کا علاج ناممکن ہو جاتا ہے۔ "جندر" ایک شکست خوردہ اور ریخت و کرب میں مبتلا شخص کی ہی کہانی نہیں بلکہ 'جندر' تو علامتی طور پر اس تہذیب کے خاتمے کی کہانی بیان کر رہا ہے جس کے خاتمے کے ساتھ ہی اس سے وابستہ تمام انسان بھی دھیرے دھیرے سسک سسک کر ختم ہونے لگے۔ ناول کا آغاز ان الفاظ سے ہوتا ہے:

---

i. ایم فل سکالر
ii. لیکچرار، شعبہ اردو، اسلامیہ کالج پشاور
iii. اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ اردو، اسلامیہ کالج پشاور

> ”مجھے یقین ہے کہ جب پو پھٹے گی اور روشنی کی کرنیں دروازوں کی درزوں سے اندر جھانکیں گی تو پانی سر سے گزر چکا ہو گا۔ اور میری سانسوں کا زیر و بم جو اس وقت جندر کی کوک ارندی کے شور سے مل کر ایک کرب امیز سماں باندھ رہا ہے، کائنات کی اتھا گہرائیوں میں گم ہو چکا ہو گا اور پیچھے صرف بہتے پانی کا شور اور جندر کی اداس کوک ہی رہ جائے گی“۔[2]

یوں لگتا ہے کہ جیسے ’جندروئی‘ نے محض خواب دیکھا تھا۔ اس کی تمام زندگی جو ایک جندر کے ساتھ گزرتی ہے۔ وہ ایک آن میں محض مشین کے ذریعے کچھ اس طرح سے ختم ہو جاتی ہے جیسے کہ وہ کسی مشین کا پرزہ ہو اور خراب ہونے پر کسی دوسرے پرزے کے ذریعے تبدیل کر دیا ہو۔ کچھ اسی طرح کا آغاز اختر رضا سلیمی کے دوسرے ناول ”جاگے ہیں خواب میں“ بھی ملتا ہے اس ناول کا آغاز بھی اس جملے سے ہوتا ہے۔

> ”یہ سب خواب سا ہے بالکل خواب سا، زمانے نے پتھریلے تکیے پر سر رکھ کر خلا میں گھورتے ہوئے سوچا“۔[3]

اس قدیم تہذیب کے علمبر دار جندر کے مرکزی کردار جندروئی کی بد نصیبی کا نوحہ سننے کو ملتا ہے:

> ”۔۔۔جب تک جندر کے پچھواڑے میں موجود، معدوم ہوتے راستے پر سے گزرتے ہوئے کسی شخص کو اچانک میرا خیال نہ آجائے اور وہ یوں ہی بغیر کسی پیشگی منصوبے کے محض میرا اتا پتا کرنے جندر کے صحن کو اس اجاڑ راستے سے ملانے والے، سات قدمی زینے پر سے اترتا ہوا جندر کے دروازے تک نہ آجائے۔ یہ دروازہ، جسے میں رات سونے سے پہلے ہمیشہ اندر سے کنڈی لگایا کرتا تھا: آج اسے بند کرتے ہوئے میں نے احتیاطاً کنڈی نہیں لگائی؛ کیونکہ میں جانتا ہوں کہ آج میری زندگی کی آخری رات ہے اور میرے بعد اسے مانوس یا ان جانی دستک پر اندر سے کھولنے والا کوئی نہیں ہو گا“۔[4]

یہ ناول معدومیت کا استعارا ہے۔ وہ اس معدوم ہونے والی تہذیب یا اگر یہ کہا جائے تو بجا ہو گا کہ نئی تہذیب کے زرد میں آنے والی قدیم تہذیب اس درجہ سسکنے پر مجبور ہے کہ اس کی سانسیں محض ایک چونگ کے ہونے سے چلتی ہیں اور جس وقت وہ ایک چونگ ختم ہو گئی تو اس تہذیب کے تمام نمائندے بھی اوندھے منہ گر پڑیں گے۔ جندر کے چلنے سے انسان میں خون چلتا تھا۔

> ”اب اسے اتفاق کہیے یا میری پیش بینی کی صلاحیت کہ جیسا میں سوچتا ویسا ہی ہوتا۔ ایک دو دن بعد پھر کوئی نہ کوئی چونگ آجاتی اور میں اسے جندر کے کھارے میں انڈیل کر جوں ہی لکڑی کی کیل نیچے گراتا جندر کی اداس کوک سریلی گونج میں تبدیل ہو جاتی اور میرے مضمحل بدن میں سیروں خون دوڑ جاتا“۔[5]

قدیم تہذیب کا نوحہ یہ بھی ہے کہ اس کے علمبر دار پورے وثوق سے بتا سکتا ہے کہ جدید تہذیب اس کی موت پر فاتحہ بھی نہیں پڑھے گا۔ یہاں تضاد کا انتہائی درجہ بتایا گیا ہے۔ واضح رہے کہ جہاں پر تضاد ہو وہاں پر تصادم کا ہونا لازم ہو جاتا ہے۔ جندر اس قدیم اور جدید تہذیب کے رونما ہونے کے بعد تضا کا نمائندہ ناول ہے۔

> ”گزشتہ پینتالیس دنوں میں جب میں اپنی ماں اور اپنی موت دونوں کا ہاتھ اپنے شانوں پر محسوس کر رہا ہوں، میں نے اپنی موت کے بارے میں اتنا نہیں سوچا جتنا کہ اس آدمی بارے میں جو میرے بعد یہاں۔۔۔۔۔ اس ویران جندر پر۔۔۔ آنے والا پہلا شخص ہو گا۔ وہ کون ہو گا؟ اتنے دن کی سوچ بچار کے بعد میں اس بارے میں کچھ وثوق سے نہیں کہہ سکتا۔ ہاں یہ بات پورے وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ وہ میرا بیٹا راحیل نہیں ہو گا“۔[6]

جدید دور میں انسان بھی گروہوں میں تقسیم ہو گیا۔ انسان کے ساتھ ساتھ اس کے رہن سہن کے لیے بھی علیحدہ جگہیں مختص ہو گئیں۔ شہری زندگی کو لوگ ترجیح دینے لگے۔ مگر وہ دیہی زندگی کو ناپسند کرنے کے باوجود بھیپر سکون سمجھے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ احیل جو جدید تہذیب کا آدمی ہے۔ دیہات سال میں محض دو دفعہ آتا ہے۔ وہ بھی آب وہوا بدلنے کے لیے۔ وہ بیوی بچوں سمیت برف باری سے لطف اندوز ہونے کے لیے خوش ہوتے ہیں مگر دیہات کی سردی برداشت نہیں کر سکتے۔ اور ان کو ہمیشہ بیمار ہونے کا خوف رہتا ہے۔ یہاں پر ’ولی‘ ایک اور خوف کا ذکر کر رہا ہے اور وہ ہے انسان کا مشین کے ساتھ مشین بننا۔ انسان مشینی زندگی میں اتنا گہرائی تک جا چکا ہے کہ وہ اس سے نکل نہیں سکتا۔ گویا کہ یہ اس کی چوائس کی زندگی نہیں تھی بلکہ اسے زر پرست

بنادیا گیا ہے۔ یعنی کہ اسے اس میں دھکیل دیا گیا ہے۔ وہ اتنا زر پرست اور مشینی زندگی کی زنجیروں میں جکڑ چکا ہے کہ وہ کسی دوسرے انسان کی موت کا سن کر پریشان اس لیے نہیں ہوتا کہ اس سے مرنے والا جدا ہوا ہے بلکہ وہ انسان کی موت کو بھی اپنی مشینی زندگی اور کام میں خلل سمجھتا ہے۔

> ”جب بذریعہ فون میرے بیٹے کو اس کے دفتر میں میری موت کی اطلاع دی جائے گی تو وہ یقیناً دفتر کے ضروری معاملات نمٹا رہا ہو گا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ وہ اس وقت کسی اہم میٹنگ میں ہو اور اس کے ذاتی سٹاف میں سے کوئی شخص یہ اطلاع کا غذ پر لکھکر بھجوائے اور اسے میٹنگ سے اٹھ کر آنا پڑے۔ بہر حال جیسے ہی اسے یہ اطلاع ملے گی وہ یک دم سکتے میں آجائے گا۔ اس لیے نہیں کہ اس کے باپ کی موت واقع ہو چکی ہے بکہ اس لیے کہ مجھے کفنانے دفنانے کے لیے ہر حال میں یہاں آنا پڑے گا اور وہ بھی اپنے بچوں سمیت“۔[7]

جندر کا مرکزی کردار ولی خان ہے۔ ولی محض ایک کردار نہیں بلکہ ایک تہذیب کی عکاسی کرتا ہے۔ اور وہ بھی ترک شدہ تہذیب۔ بلکہ مسترد شدہ تہذیب کی۔ جب وہ کہتا ہے کہ:

> ”میرا یہاں اس طرح مرنا صرف ایک انسان کی نہیں ایک تہذیب کی موت ہے“۔[8]

اس جملے میں اس نے پورے جدید مشینی تہذیب اور زر پرست انسانکے منہ پر طمانچہ رسید کیا ہے۔ یہ اس تہذیب کی موت کا نوحہ خواں بھی کوئی نہیں جس کی وجہ سے مشینی تہذیب کو اساس فراہم ہوئی۔ یہ ہتھ چکی ہی تھی جس کو بنیاد بنا کر پن چکی کی بنیاد رکھی گئی۔ اسی لیے تو جندر میں کہا گیا ہے کہ پن چکی بنانے والا سائنسدان بھی کسی جندروئی کا ہی بیٹا ہو گا یا پھر کوئی رشتہ دار۔

> ”جندر ہی کی کوکھ سے پیدا ہونے والی پن بجلی سے چلنے والی پن چکیاں اب ہر گاؤں میں نصب ہونے لگی ہیں“۔[9]

جندر اور جندروئی کی یہ کہانی دراصل ہزارا کے ایک گاؤں کی کہانی ہے۔ گاؤں کے سب لوگ اجتماعی زندگی گزار رہے ہیں۔ گاؤں کا راجہ جب جندر بنانے کا تہیہ کر لیتا ہے تو پورے گاؤں کے لوگ اس کار خیر مین حصہ لینے کے لیے سرگرم عمل ہو جاتے ہیں۔ ان ہی میں سے ولی ک ادادا احمد خان اور اس کا بھائی محمد خان ہیں۔ وہ خاموشی سے کھانا کھا کر نکل پڑتے ہیں۔ اور رات کو جو پاٹ جندر کے لیے اوتار سے لایے گیے ہوتے ہیں ان ہی کو واپس تن تنہا لے جاتے ہیں۔ جب اگلے دن راجا کے سامنے ان کی پیشی ہوتی ہے اور وجہ پوچھتے ہیں تو وہ کچھ یوں گویا ہوتے ہیں:

> ”اچھا یہ بتاؤ تم نے یہ کام کیوں کیا؟ راجا نے ازراہ مذاق ان سے پوچھا۔ اس ہتک کی وجہ سے جو اس دن آپ نے ہمیں دوسروں سے علیحدہ بٹھا کر اور ہمیں روکھی سوکھی دے رکھی تھی“۔[10]

راجا ان کے ساتھ ایک شرط لگاتا ہے۔ وہ راجا سے شرط جیت کر بطور انعام جندر حاصل کر لیتے ہیں۔ اس وقت ان کو یہ علم نہیں تھا کہ ایک دن ان کا پوتا اسی جندر کی وجہ سے معاشرے کے لعن طعن کا نشانہ بنے گا۔ گویا کہ ہر انسان ہر وقت کسی نہ کسی حادثہ کی تعمیر میں مگن رہتا ہے اور ستم یہ کہ وہ اس سب پر خوش بھی ہوتا ہے۔

> ”میں سمجھتا ہوں کہ میرا یہاں اس طرح مرنا اسی وقت طے ہو گیا تھا۔ جب راجا انہیں یہ جگہ بطور انعام پیش کرنے کا اعلان کر رہا تھا“۔[11]

ولی کی شادی حاجرہ سے ہو جاتی ہے۔ حاجرہ ولی کی چچازاد بہن ہے۔ یہ شادی حاجرہ ہی کے پسند سے ہو جاتی ہے مگر محض سال سوا سال چلنے کے بعد اس کا اختتام ہو جاتا ہے۔ اس کی وجہ بھی جندر ہی بنتا ہے۔ بیوی حاجرہ ہے جو ولی کو کہا کرتی تھی:

> ”تم ایک آزاد مرد ہو زندگی کے تمام بندھنوں اور بکھیروں سے آزاد“۔[12]

حاجرہ سے ولی کا ایک بیٹا راحیل پیدا ہوتا ہے۔ راحیل بڑا ہو کر افسر بنتا ہے۔ وہ شہر میں رہائش اختیار کر لیتا ہے۔ والدہ بھی اس کے ہمراہ شہر چلی جاتی ہے اور وہی ں انتقال کر جاتی ہیں۔ والدہ کی طرح راحیل بھی والد کے کام سے نالاں ہے۔ بالخصوص جب وہ افسر بن جاتا ہے تو اس کا والد اور اس کے والد کا کام اس کے لیے ایک طعنہ بن جاتا ہے۔

> ”جب سے وہ افسر بنا ہے اسے کئی لوگوں کی طرف سے طعنے مل رہے ہیں۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ جب کچھ عرصہ پہلے مجھے دمے کا شدید دروا پڑا اور وہ مجھے شہر لے تو ڈاکٹر کے پاس جاتے ہوئے اس نے مجھ سے نظریں چراتے ہوئے کہا تھا کہ ابا ڈاکٹر صاحب کو نا بتانا کہ آپ جندروئی ہیں“۔[13]

یہاں میر کے شعر کے مصداق ولی ان تن تنہا پوری تہذیب کا بوجھ اپنے کندھوں پر اٹھا رکھا ہے۔

سب پہ جس بار نے گرانی کی

اس کو یہ ناتواں اٹھا لایا [14]

مشینی زندگی نے نا صرف انسان کو مشین بنایا بلکہ اس سے اس کے ہی خون سے وجود پانے والوں کو بھی جدا کر دیا۔ جدید تہذیب کے منہ پر اس سے بڑا طمانچہ اور کیا ہو سکتا ہے کہ وہ قدیم تہذیب کے وجود کو اپنے لیے ایک طعنہ سمجھتا ہے۔ اسے قبول تو درکنار محض اس کا ہونا بھی برداشت نہیں کر سکتا۔ ایک بیٹے کے اس طرح کے رویے سے اس پوری تہذیب اور سماج کے ظرف اور تنگ نظری کا اندازہ ہو جاتا ہے۔

"سب سے بڑی مصیبت تو یہ ہو گی کہ اس کے دفتر کے وہ ساتھی جنہیں مرغوب کرنے کے لیے اس نے اپنے باپ دادا کی داداگیری کے دلچسپ قصے سنائے ہوئے ہوں گے اور وہ اس کی عزت اور توقیر ایک اعلیٰ افسر سے زیادہ ایک اعلیٰ حسب ونسب والی شخصیت کے طور پر کرتے رہے ہوں گے۔ اس کے ناچتے ہوئے بھی تعزیت کے لیے آجائیں گے اور وہ گاؤں والوں کی باتوں سے جو دبے لفظوں میں پہلے ہی اسے اس حوالے سے طعن لعن کرتے رہتے ہیں، کسی نہ کسی طرح جان جائیں گے کہ اس کا باپ ایک جندروئی تھا"۔[15]

یہ سب کچھ ہونے کے باوجود اور تمام معاشرے کی مزاحت کے باوجود بھی ولی جندر کو نہ چھوڑ سکا۔ کیونکہ وہ جندر کی سریلی آوازوں کا عادی ہو چکا تھا۔

"آوازوں کے صرف نام رکھے جاسکتے ہیں ان سے ملنا یا کرختگی کو بیان نہیں کیا جاسکتا۔ ایک ایسے شخص جس کی زندگی بھر کبھی کوئل کی کوک نہ سنی ہو۔ صرف اس بارے میں کتابوں میں پڑھا ہو کبھی نہیں جان سکتا کہ اس کی ماہیت کیا ہوتی ہے"۔[16]

ماضی میں انسان اجتماعی زندگی گزارتا تھا۔ اس وقت انسان خود غرض اور زر پرست نہیں بنا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ زمین سے بھی باوفائی کرتا تھا۔ وہ زمین کی بوائی کو اپنے وجود کے لیے لازمی سمجھتا تھا۔ ہزارا کے رہائشی بھی اجتماعی طور پر بوائی اور کٹائی کرتے تھے۔ اس میں مرد عورت بچے بوڑھے سب شامل ہوتے تھے۔ انسانوں کے ساتھ ساتھ وہ محصول شدہ فصل میں سے خدا کا بھی ایک حصہ الگ کر لیتے تھے۔ ولی اس تہذیب کے اجتماعی زندگی سے آگاہ تھا۔ اس لیے وہ بے خوف تھا۔ وہ جس تہذیب میں پیدا ہوا تھا اسی میں مرنا بھی چاہتا تھا۔ اسے اپنے وجود سے زیادہ اس تہذیب کے مٹنے کا خطرہ لاحق تھا کہ اس کی موت کے بعد ہمیشہ کے لیے تہذیب بھی ختم ہو جائے گی۔ لیکن موت واحد چیز ہے جو انصاف اور عدل کرتا ہے۔ موت جدید ور قدیم دونوں کو آتی ہے۔ اس لیے ناول نگار کہتا ہے کہ:

"زندگی کے ہزار رنگ ہیں۔ موت کا ایک ہی رنگ ہے، سیاہ رنگ۔ جو زندگی کے تمام رنگوں کو اپنے اندر جذب کر لیتا ہے۔ مجھے زندگی کا شعور بعد میں ہوا میں نے موت کے سیاہ رنگ کا شعور پہلے حاصل کیا"۔[17]

انسان سینکڑوں سال گزارنے کے بعد بھی کچھ یاد نہیں رکھتا۔ وہ جوں کا توں زندگی کی گاڑی چلاتا رہتا ہے۔ اس کی زندگی پر زندگی کے اثرات نہیں ہوتے مگر موت واحد چیز ہے جو انسان کو یہ باور کراتی ہے کہ ایک دن مرنا ہے۔ یعنی فنالزم ہے۔ اللہ تعالیٰ کا قرآن کریم میں ارشاد ہے: "اور ہر ذی روح کو موت کا مزہ چکھنا ہو گا"۔[18]

"موت ہی واحد چیز ہے جو انسانی دماغ پر گہرا اثر چھوڑتی ہے۔ خدا کے وجود سے انکار کرنے والے تو آج بھی دنیا میں بے شمار موجود ہیں مگر شاید ہی دنیا میں ایسا باشعور انسان کوئی ہو جو موت کے وجود سے انکاری ہو۔ موت پر سب کا ایمان ہے۔ ہر باشعور انسان کو موت کا بھی اتنا ہی یقین ہوتا ہے جتنا زندگی کا"۔[19]

ولی کے ذہن میں بس یہی بات گردش کرتی ہے کہ وہ جس تہذیب میں پیدا ہوا تھا اسی میں مرا کیوں نہیں۔ اگر وہ اپنی ہی تہذیب میں مر جاتا تو شاید اس کے والد کی طرح اس کا لوگ جنازہ بھی ادا کرتے۔ مگر جدید دور میں چونکہ انسان کے پاس صرف انسان کے لیے وقت نہیں اس لیے انسان نے انسان کو قبول کرنے سے انکار کیا۔ قدیم دور کو یاد کرتے ہوئے وہ گویا ہوتا ہے کہ:

”اگر میری موت بیس بچیس سال پہلے، یہاں اسی صورت میں واقع ہوتی میری لاش کو اس طرح گلنے سڑنے کا کوئی اندیشہ لاحق نہ ہوتا کہ ان دنوں جندر کے پچھواڑے سے گزرنے والا یہ راستہ جواب تقریباً معدوم ہو چکا ہے، خاص آباد ہوا کرتا تھا“۔[20]

اسی طرح وہ کہتا ہے:

”۔۔۔ دو تین متواتر آوازوں کے بعد جب میرے جسم میں کوئی حرکت نہ ہوتی تو وہ ہاتھوں سے ہلا کر میری طرف لپکتا۔ اور جوں ہی اپنا ہاتھ میرے سرد ہو چکے جسم سے مس کرتا اس کی گھگھی بندھ جاتی اور وہ بے اختیار میری لاش سے لپٹ کر رونا شروع کرتا۔۔۔۔“۔[21]

لیکن جب اس نے تہذیب کو مٹتے اور ختم ہوتے دیکھا اور چونکہ یہ سب اس کی آنکھوں کے سامنے ہوا۔ اس لیے وہ اپنے خاتمے کے خوف میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ انسان کا المیہ ہی تب شروع ہو جاتا ہے۔ جب زوال اس کا مقدر ٹھہر تا ہے۔

حوالہ جات

-1 ساغر صدیقی، کلیات، لاہور، مکتبہ امتیاز، سن ندارد، ص نہ دارد۔
-2 اختر رضا سلیمی، جندر، راولپنڈی، رومیل ہاس اف پبلی کیشنز، سہ ۲۰۱۷، ص ۷۔
-3 اختر رضا سلیمی، جاگے ہیں خواب میں، لاہور، شرکت پرنٹنگ پریس، مارچ ۲۰۱۵ء، ص ۱۱۔
اختر رضا سلیمی، جندر، راولپنڈی، رومیل ہاس اف پبلی کیشنز، سہ، ۲۰۱۷ء، ص ۷۔
-4 ایضاً، ص ۷۔
-5 ایضاً، ص ۸۔
-6 ایضاً، ص ۹۔
-7 ایضاً، ص ۱۱۔
-8 ایضاً، ص ۱۰۶۔
-9 ایضاً، ص ۱۰۸۔
-10 ایضاً، ص ۳۳۔
-11 اختر رضا سلیمی، جندر، راولپنڈی، رومیل ہاس اف پبلی کیشنز، سہ ۲۰۱۷، ص ۳۸۔
-12 اختر رضا سلیمی، جندر، راولپنڈی، رومیل ہاس اف پبلی کیشنز، سہ ۲۰۱۷، ص ۸۶۔
-13 اختر رضا سلیمی، جندر، راولپنڈی، رومیل ہاس اف پبلی کیشنز، سہ ۲۰۱۷، ص ۳۹۔
-14 میر تقی میر، میر، انتخاب کلام میر، انتخاب، ارشد محمود، ڈاکٹر، اسلام آباد، نیشنل بک فاؤنڈیشن، ۲۰۱۵ء، ص ۹۷۔
-15 اختر رضا سلیمی، جندر، راولپنڈی، رومیل ہاس اف پبلی کیشنز، سہ ۲۰۱۷، ص ۱۲۔
-16 اختر رضا سلیمی، جندر، راولپنڈی، رومیل ہاس اف پبلی کیشنز، سہ ۲۰۱۷، ص ۵۳۔
-17 اختر رضا سلیمی، جندر، راولپنڈی، رومیل ہاس اف پبلی کیشنز، سہ ۲۰۱۷، ص ۱۰۲۔
-18 قرآن مجید، سورۃ الاعمران، پارہ نمبر ۴، لن تنالو البر، آیت نمبر ۱۸۵۔
-19 اختر رضا سلیمی، جندر، راولپنڈی، رومیل ہاس اف پبلی کیشنز، سہ ۲۰۱۷، ص ۱۰۴۔
-20 اختر رضا سلیمی، جندر، راولپنڈی، رومیل ہاس اف پبلی کیشنز، سہ ۲۰۱۷، ص ۲۱۔
-21 اختر رضا سلیمی، جندر، راولپنڈی، رومیل ہاس اف پبلی کیشنز، سہ ۲۰۱۷، ص ۲۶۔